مارکسی نکتۂ نظر

اور

ہمارا ادب

از

محمد اسلم رسول پوری

بزم ادریس رسول پور
ڈیرہ غازیخان

5.83

1.00.

تعارف

مجھے کتابچہ "مارکسی نکتۂ نظر اور ہمارا ادب" کے بارے میں یہ عرض کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے کہ اپنے موضوع کا یہ ایک سرسری اور مختصر مطالعہ ہے۔ عدیم الفرصتی اور دوسرے ذرائع کی کمی نہ ہوتی تو یقیناً یہ ایک ضخیم کتاب ہوتی۔

میں یہاں اپنے مہربان دوست پروفیسر سلیمان بدر گورنمنٹ کالج ڈیرہ غازی خان کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ انہوں نے مجھے اس موضوع پر لکھنے کی تحریک کی۔ اگر وہ یہ تحریک نہ کرتے تو شاید یہ مقالہ کبھی سپردِ قلم نہ ہوتا۔

اس کے ساتھ رئیس قدیم اور کاوش عباسی کا بھی ممنون ہوں — جنہوں نے فکری اور علمی طور پر اس مقالے کی نوک پلک درست کرنے میں مدد دی۔

×

محمد اسلم رسول پوری ایم۔اے

۲۷ر اکتوبر ۱۹۷۴ء

ادب کی تعریف

پیشتر اس کے کہ میں ادب کے بارے میں مارکسی نکتۂ نظر بیان کروں۔ مجھے ادب کی تعریف کر لینی چاہیئے۔ "ادب انسان کے ان جذبات اور خیالات کے منظوم یا خوبصورت منثور اظہار کا نام ہے۔ جو اس کی زندگی کے حالات اور اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں" اس نکتۂ نظر سے ایک طبقاتی سماج میں ادب بھی طبقاتی ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ وہ نہ صرف اپنے خالق یعنی ادیب کی بلکہ اس کے طبقے کی سوچ اور فکر کی بھی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لئے مارکسزم کے نظریے کی رو سے جب انسان ظالم اور مظلوم طبقوں میں منقسم ہو گئے۔ تو ادب بھی

ادب کے بارے میں مارکسی نکتۂ نظر

دو حصوں میں بٹ کر رہ گیا۔ ادب کا ایک حصہ ظالم طبقے کے مفادات، خواہشات اور خیالات کی نمائندگی کرنے لگا۔ اور دوسرا حصہ مظلوم طبقے کے مفادات اور خیالات کا عکاس ٹھہرا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ جب بھی ان دو طبقوں کے درمیان کوئی جنگ ہوئی۔ تو مختلف طبقوں کے شعراء اور ادباء نے اپنی اپنی تخلیقات کے ذریعے اپنے طبقے کے لئے کام کیا۔ اس طرح جو ادب مظلوم طبقے کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے تیار کرتا رہا۔ وہ ترقی پسند ادب کہلایا۔ اگرچہ اس کی شکلیں موجودہ ترقی پسند

ادب سے مختلف بھتی۔ کیونکہ اس میں واضح قسم کی طبقاتی سوجھ مفقود تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی لینن نے ایسے ادب کو زندہ رکھنے کی حمایت کی۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج سوویت یونین میں قدیم ادیب وشاعر مثلاً لیو ٹالسٹائی۔ فیودر وسکی۔ پشکن چیخوف اور گوگول وغیرہ کی تخلیقات کو بڑے نمایاں انداز سے شائع کیا جاتا ہے۔ کیونکہ ان میں حقیقت پسندی اور بعض جگہ انقلابیت کا گہرا پرتو ملتا ہے۔

بہرحال مارکسزم کے نزدیک ادب کی نوعیت واضح طور پر طبقاتی ہوتی ہے۔ اس لئے اس نے اپنے معاشی نظریات کے ساتھ اس بات کا بھی اعلان کیا کہ اسے ادب کے صرف اس حصّے سے دلچسپی ہے جو پرولتاریہ کے مفادات، خواہشات اور جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اور انہیں ان کی عظمت اور فتح کا یقین دلاکر اپنے حقوق اور روشن مستقبل جیتنے کے لئے اکساتا ہے۔ مارکسزم ایسے ادب کو زندگی آموز ادب کہتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہی وہ ادب ہے۔ جو انسان کے اندر جینے کا حوصلہ پیدا کرتا ہے۔

ادب کی اہمیت | جہاں تک ادب کی اہمیت کا تعلق ہے۔ مارکسزم

کے نزدیک وہ اٹل قسم کی ہے۔ کیونکہ لینن نے ادب کو "مشین کے تربیچ" سے تشبیہ دی ہے۔ جس طرح کسی مشین کے تربیچ نکال دیئے جائیں تو وہ بے کار ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر کسی سماج سے اس کے ادب کو خارج کر دیا جائے۔ تو وہ بھی ایک گونگے جامد اور ٹھس قسم کے سماج میں تبدیل ہو کر رہ جائے۔

لینن کے حالاتِ زندگی سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنی زندگی کے شدید بحرانی دور میں بھی ادب کی اہمیت کا قائل تھا۔ اور وہ اس سے سکون اور تازگی حاصل کرتا تھا۔ جس کو ولیم جیمز MORAL HOLIDAY کہتا ہے۔ اور جس سے ہمارے اندر عملی زندگی کی نئی تاب پیدا ہوتی ہے۔

اسی طرح کارل مارکس بھی ادب کا باقاعدہ مطالعہ کرتا تھا۔ اس کے محبوب ادیبوں اور شاعروں میں ہومر۔ ورجل شیکسپیئر دانتے۔ گوئٹے اور شیلے شامل تھے۔

بہرحال مارکسزم ادب کی اہمیت کا زبردست قائل ہے۔ اور وہ اس کے ذریعے سماج میں انقلابی تبدیلیاں پیدا کرنا چاہتا ہے اور ایسے ادب کی پر جوش حمایت کرتا ہے۔ جو سوشلسٹ سماج کے لئے پرولتاریہ طبقے کو تیار کرے اور

اس کی جد وجہد میں اس کا ساتھ دے۔

دیگر نظریات اور مارکسزم

اس زندگی آموز ادب کے نظریے کے علاوہ جسے عام طور پر ترقی پسند ادب یا ادب برائے زندگی کہا جاتا ہے۔ مارکسزم ادب کے دوسرے تمام نظریات کو رد کر دیتا ہے۔ خصوصاً ادب برائے ادب کے نظریے کو۔ کیونکہ اس نظریے پر ایمان رکھنے والے ادیب نہ صرف سرمایہ دارانہ نظام کی بقا کی حمایت کرتے ہیں۔ بلکہ ہمیشہ استحصالی طبقے کا ساتھ دیتے ہیں۔ کارل مارکس کے سوانح نگار FRANZ MAHRING نے لکھا ہے۔ کہ کارل مارکس ادب برائے ادب کے نظریے کو خطرناک چیز سمجھتا تھا۔

غیر جانب داری کا ڈھونگ

ادب برائے ادب کے حامی اپنے غلط نظریات کو چھپانے کے لئے عموماً غیر جانب داری کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ حالانکہ یہ ایک ناممکن العمل چیز ہے۔ کیونکہ جب سماج دو طبقوں میں منقسم ہو۔ تو لازمی طور پر ہر شخص کی ہمدردی کسی نہ کسی طبقے کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ وہ خود بھی ان طبقوں میں سے کسی ایک کے

ساتھ معاشی اور سماجی طور پر وابستہ ہوتا ہے۔ اس لئے غیر جانبداری کا مطلب بقول ماؤزے تنگ "سچ اور جھوٹ کے درمیان ــــ غیر جانب داری ہے۔ جو قطعی ناممکن ہے۔ کیونکہ سچ اور جھوٹ کے درمیان تیسری کوئی صورت نہیں ہوا کرتی"۔ اور اگر ہو بھی تو وہ سمجھوتے کی صورت ہوتی ہے۔ جو ہمیشہ بالادست اور ظالم طبقے کی خدمت کرتی ہے۔

فرائیڈ کا نظریۂ جنس

اس کے علاوہ ایک اور بھی نظریہ ہے۔ جسے "فرائیڈ کا نظریۂ جنس" کہا جاتا ہے۔ بعض ادیب اور شاعر اس نظریے پر جان چھڑکتے ہیں۔ اردو ادب میں میراجی کی شاعری اور ممتاز مفتی کے افسانے اس نظریے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ مارکسزم کے نزدیک بقول ممتاز حسین " لاشعور کو صرف جنسی تجربوں تک محدود کر دینے کا نظریہ اور اپنے احساس کو اصل حقیقت سمجھنے کا نظریہ خالص رجعت پرست ہے۔ اس سے سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ یہ خارجی دنیا کو ادب سے خارج کر دینے کا نظریہ ہے۔ انسانی ذہن اور احساسات کو طبقاتی جنگ دیکھنے سے روکتا ہے۔ یہ نظریہ

کسی بھی شئے کی خارجیت اور آزاد وجود کو نہیں مانتا ....
مظلوم طبقوں کے لئے یہ زہرِ ہلاہل کے برابر ہے۔"

اس لئے فرائیڈی ادیب طبقاتی لڑائی کو بھی جبلت جنس کی پیداوار کہہ کر فوراً حکومت یا ظالم طبقے کے ساتھ ہو جایا کرتے ہیں۔ لہذا مارکسزم کے نزدیک ادب برائے ادب کی طرح یہ نظریہ بھی بے حد خطرناک ہے۔ اور اس کا مقابلہ ضروری ہے۔

تخلیقِ ادب کی شرائط

مندرجہ بالا تحریر سے ادب کے بارے میں مارکسزم کا نکتۂ نظر واضح ہو چکا ہے۔ آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ کیا مارکسزم ترقی پسند ادب کی تخلیق کے لئے کچھ شرائط کا بھی تعین کرتا ہے یا نہیں۔ —— جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے۔ مارکسزم اس کیلئے کچھ شرائط کا تعین ضرور کرتا ہے۔ اور وہ اس لئے تاکہ ادب عوام کے لئے زیادہ موثر اور مفید ثابت ہو۔ اس سلسلے میں وہ سب سے پہلے اس بات پر زور دیتا ہے۔ کہ محنت کشوں کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کیا جائے۔ ورنہ اس کے بغیر ان کے بارے میں حقیقت پسندانہ اور سچے ادب

کی تخلیق ناممکن ہو گی۔ ماؤزے تنگ اپنی تصنیف "فن وادب کے مسائل" میں کہتا ہے۔" محنت کش طبقہ کے مسائل کا شعور حاصل کئے بغیر۔ اس طبقہ کی زندگی کا قریبی مطالعہ کئے بغیر اور اس طبقہ سے قریبی تعلق استوار کئے بغیر آپ لوگ ان افراد اور اس طبقہ کی طبقاتی نوعیت نہیں سمجھ سکتے۔ اگر نام نہاد دانشور حضرات مزدوروں کسانوں اور سپاہیوں کی طرزِ زندگی کا جھوٹا لبادہ اوڑھ لیں تو اس کی اصل حقیقت نیم بورژوازی ہی رہے گی"۔

اس لئے مارکسزم کے نزدیک ترقی پسند ادب کی تخلیق کے لئے پہلی شرط محنت کشوں کی زندگی کا براہِ راست شعور اور ان کی طبقاتی جدوجہد میں شامل ہونا ہے۔

اس سلسلے میں دوسری شرط عوامی زبان کا استعمال ہے اگر کوئی ادیب اپنی تخلیقات کے لئے بڑی فاضلانہ اور مصنوعی زبان استعمال کرے۔ جس سے ان پڑھ اور کم تعلیم یافتہ محنت کشوں کے لئے ابلاغ ناممکن ہو۔ تو مطلوبہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں ماؤزے تنگ کہتا ہے

"اگر ہم عوامی زبان سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ تو فن وادب

کی تخلیق بے معنی ہے .... آپ جتنی بھی بناوٹ اختیار کریں گے ۔ آپ جس قدر اپنے طرزِ تحریر سے اپنی علمیت بگھاریں گے۔ اسی شدت سے عوام آپ کے جذبات وخیالات کو ٹھکرادیں گے"

اس اقتباس کی روشنی میں یہ بات بخوبی عیاں ہوتی ہے ۔ کہ غیر عوامی زبان کے استعمال سے نہ صرف انقلاب کے حق میں کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلتا۔ بلکہ اس کا الٹا اثر بھی ہوتا ہے۔

ترقی پسند ادب کی تخلیق کے لئے مارکسزم کی تیسری شرط فن و مقصد کا امتزاج ہے ۔ اگر کسی تخلیق میں مقصدیت موجود ہو۔ لیکن اس کی فنی حیثیت کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ تو مارکسزم کے نزدیک ایسا ادب بے سود اور غیر مؤثر ہے۔ اس کے برخلاف اگر کوئی فن پارہ فنی حیثیت سے شہکار ہی کیوں نہ ہو ۔ لیکن اس میں انقلاب دشمنی پائی جائے ۔ تو وہ بھی مارکسزم کے نزدیک بالکل لغو ہے ۔ اس سلسلے میں ماؤزے تنگ واضح انداز میں مارکسزم کا نکتۂ نظر بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے ۔

"سیاسی طور پر کوئی ادب کتنا ہی ترقی پسند کیوں نہ ہو

بغیر فنی حسن کے سب کچھ بے معنی اور غیر موثر ہے۔ ہم صرف ایسے فن کو ہی رد نہیں کرتے۔ جس میں انقلاب دشمنی کی روح ہو بلکہ ایسی تخلیقات کو بھی ہم قابلِ مذمت سمجھتے ہیں۔ جن کا اسٹائل اشتہاری اور نعرہ بازی طرز کا ہو"

اس اقتباس کی روشنی میں تمام وہ تخلیقات غیر معیاری قرار پاتی ہیں۔ جن میں انقلاب کی گھن گرج تو پائی جائے۔ لیکن فنی حسن کا نام و نشان بھی نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تمام بڑے بڑے ترقی پسند ادیب و شاعر مثلاً گورکی۔ پٹونی پیلو نرودا، رالف فاکس۔ لوہسون۔ ناظم حکمت۔ مخدوم محی الدّین۔ فیض احمد فیضؔ۔ سردار جعفری۔ کرشن چندر۔ ساحرؔ لدھیانوی۔ امرتا پریتم، شولوخوف اور تنقید میں ممتاز حسین کی تخلیقات میں فن و مقصد کا خوبصورت امتزاج پایا جاتا ہے۔

سطورِ بالا سے یہ بات بخوبی عیاں ہوگئی ہے۔ کہ مارکسزم کے نزدیک اسی ادب کی اہمیت ہے۔ جو واضح طور پر ترقی پسند طاقتوں کا نمائندہ ہو۔ اور اسے پورے جوش اور جذبے کے ساتھ کروڑوں محنت کشوں کو انقلاب کے لئے تیار کرنا چاہیے۔

★

اب ہمیں مارکسزم کی روشنی میں اردو ادب پر ایک سرسری نگہ ڈالنی چاہیئے۔

قدیم اردو ادب

جہاں تک قدیم اردو ادب کا تعلق ہے اس کی پرورش ٹوٹتے ہوئے جاگیردارانہ نظام میں ہوئی ہے۔ سو اس کے تمام تر اثرات اردو ادب میں ملتے ہیں۔ اگر انفرادی طور پر دیکھا جائے تو قدیم نثر میں میر امن کی "باغ و بہار" جاگیردارانہ دور کی مرتی ہوئی تہذیب کی عکاسی کرتی ہے۔ جس میں منطقی طور پر مایوسی کے اثرات غالب ہیں۔ بالکل یہی حالت میر تقی میر کی شاعری کی ہے۔ وہ اپنے دور کے کرب کی نمائندگی کرتے ہوئے مایوسی اور ناامیدیوں کا شکار رہتی ہے۔ اس دور میں البتہ نظیر اکبرآبادی ایک ایسا شاعر ضرور ملتا ہے۔ جسے عوامی شاعر کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس نے اپنی شاعری کے موضوعات نہ صرف عوام کی زندگی سے لئے

بلکہ زبان بھی زیادہ تر ان کی استعمال کی ہے۔

غالبؔ بڑی حد تک ایک حقیقت پسند شاعر گزرا ہے۔ اس کی شاعری انسانی زندگی کے تجربات اور جاگیردارانہ سماج کی مرتی ہوئی تہذیب پر طنز ہے۔ لیکن وہ بھی طبقاتی کشمکش کا اندازہ نہیں کر سکا۔ حالیؔ۔ اکبرؔ اور اقبالؔ کے کلام کو اگرچہ زندگی آموز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ تینوں [redacted] کے شکار نظر آتے ہیں۔ نئی تہذیب کے خلاف واویلا مچاتے ہیں اور لوگوں کو ارتقا سے روکنے کے لئے پرانے دور کی طرف واپس لے جاتے ہیں۔ لیکن بری طرح ناکام ہوتے ہیں۔ اور اس طرح رجعت پسندی کے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔

اس دور میں اگر نثر کا جائزہ لیا جائے تو وہ بھی ایسی حالت سے دوچار رہی ہے۔ "فسانۂ آزاد" جاگیردارانہ تہذیب کا مرثیہ بھی ہے اور مذاق بھی۔ سجاد حیدر یلدرم کے افسانے قطعی طور پر رومانی اور رجعت پسندانہ ہیں ــــ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول جاگیردارانہ اخلاق کے احیاء کی جدوجہد اور سرمایہ دارانہ تہذیب کو روکنے کی کوشش پر مبنی ہیں۔ جو مکمل طور پر رجعت پسندی کی صف میں آتے ہیں۔ البتہ

اس دور کے آخر میں پریم چند ایک ایسا افسانہ نگار اور ناول نویس ملتا ہے۔ جو عوام کے لئے اپنے فن کو وقف رکھتا ہے۔ وہ ان کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اور ان کی حالت کو بہتر بنانے پر زور دیتا ہے۔ اگرچہ وہ انقلاب کی بجائے اصلاح پسندی کا شکار ضرور ہے۔ لیکن پھر بھی مجموعی طور پر اس کی تخلیقات غنیمت ہیں۔

ترقی پسند ادب

یہیں پریم چند پہ اردو ادب کا ایک دور ختم ہوتا ہے۔ اور پھر یہیں سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ جسے ترقی پسند ادب کا سنہری دور کہا جا سکتا ہے۔ اس دور کا آغاز ۱۹۳۶ء سے ہوتا ہے جب چند نوجوان ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی اور اس کا منشور تیار کیا۔ ان لوگوں میں پریم چند اور حسرت موہانی بھی شامل تھے۔ اس انجمن کے سرگرم رکن اور سیکرٹری سید سجاد ظہیر تھے۔

انجمن ترقی پسند مصنفین نے جب اپنا کام شروع کیا۔ تو اس کی سوچ مکمل طور پر مارکسی تھی۔ وہ ادب کے ذریعے مزدوروں اور کسانوں کو تیار کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے مکمل طور پر

انقلابی اور رجائیت پسند ادب پیدا کیا۔ اس انجمن نے سردار جعفری۔ فیض احمد فیض۔ احمد ندیم قاسمی۔ مخدوم محی الدین۔ اسرار الحق مجاز۔ کیفی اعظمی۔ ظہیر کاشمیری۔ ساحر لدھیانوی فارغ بخاری۔ سلام مچھلی شہری۔ آغا اعجاز اکرم۔ اور کئی دوسرے شاعروں کو پیدا کیا۔ جنہوں نے اپنے غیر فانی شہ پاروں سے عالمی شہرت بھی حاصل کی۔ اور تحریک کو بھی آگے بڑھایا۔ ترقی پسند نثر لکھنے والوں میں سید سجاد ظہیر کرشن چندر۔ راجندر سنگھ بیدی۔ احمد علی۔ احتشام حسین، ممتاز حسین۔ احمد ندیم قاسمی اور کئی دوسروں نے جنم لیا۔ جنہوں نے اپنے افسانوں اور تنقید کے ذریعے اُردو ادب کو بھی مالا مال کیا۔ اور محنت کشوں کی زندگی کی عکاسی کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی شعور کو بھی تیز کیا۔

اس دور میں ترقی پسند شاعری اور افسانوں کے کئی مجموعے بھی شائع ہوئے۔ جن میں سے حکومت نے کتاب "انگارے" کو ضبط کر لیا۔

تحریک کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے بہت سے رسالے بھی میدان میں آئے۔ جن میں "نیا ادب" اور "ادب لطیف"

شامل ہیں۔ انہوں نے اپنے مشن کو کامیابی سے نبھایا۔ بلکہ گھر گھر تک پہنچایا۔ بعد میں اس تحریک میں "سویرا"، "روحِ ادب" اور "نقوش" بھی شامل ہو گئے۔

بہر حال ترقی پسند ادب کا یہ ایک جاندار دور تھا۔ جو تقسیم ہند تک بڑی کامیابی سے چلتا رہا۔ اور جس کی کہانی سید سجاد ظہیر مرحوم نے اپنی تصنیف "روشنائی" میں بخوبی پیش کی ہے۔ لیکن تقسیم کے بعد کئی ادیبوں کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا۔ نقل مکانی کی وجہ سے حالات کی تبدیلی، تقسیم میں لاکھوں انسانوں کی قتل و غارت، سیکڑوں خاندانوں کی بربادی۔ تہذیب و ثقافت کی تباہی۔ کچھ عرصہ بعد پاکستان میں انجمن پر پابندی اور سرکردہ ادیبوں و شاعروں کی گرفتاری اور اس کے بعد بیپٹڑ بورڈ والا موقع پرستی نے تحریک کو کمزور کر دیا۔ لیکن پھر بھی نئے نئے لکھنے والے پیدا ہوئے۔ جنہوں نے آج بھی ترقی پسند ادب کے چراغ کو تند و تیز ہواؤں میں روشن کر رکھا ہے۔ ان لوگوں میں حبیب جالب کا نام خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے۔

بھارت میں البتہ یہ تحریک پاکستان سے زیادہ بہتر رہی ہے

کیونکہ وہاں پاکستان کی نسبت عوام کو سیاسی آزادی زیادہ میسر رہی لیکن چونکہ کافی عرصہ سے پاکستان کے اس سے تعلق خراب تھے۔ اس لئے وہاں کے ادب کا جائزہ لینا ہمارے لئے مشکل ہے۔ البتہ پچھلے دنوں یہ تعلقات پھر بحال ہوئے ہیں۔ امید ہے اب اس سلسلے میں کچھ کہنا ممکن ہو سکے گا۔

فرائیڈی ادب

ترقی پسند ادب کے اس دور میں کلاسیکل ادب تقریباً اپنی موت آپ مر چکا تھا۔ لیکن "ادب برائے ادب" کے حامیوں نے فرائیڈی نظریۂ جنس کا سہارا لے کر اسے آگے بڑھایا۔ اور اس موضوع پر افسانے اور نظمیں لکھیں۔ ان لوگوں میں منٹو۔ عصمت چغتائی، حسن عسکری (افسانہ چائے کی پیالی) ممتاز مفتی۔ میراجی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ جیساکہ اس مضمون کے پہلے حصے میں بتایا جا چکا ہے۔ یہ ادب قطعی طور پر رجعت پسندانہ ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا ترقی پسندی سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔

جدید شاعری

تقسیم کے بعد ترقی پسند ادب کی تخلیق میں جو کمی واقع ہوئی۔ اس کے نتیجے میں پاک و بھارت میں شاعری کی ایک نئی قسم نے رواج پایا۔ جسے جدید شاعری کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ شاعری کلاسیکل شاعری کے مقابلے میں یقیناً

نئی ہے۔ اس لئے بہت سے لوگ اس کی روشنی میں چکا چوند ہو گئے ہیں۔ وہ اس پر بروقت تنقید سے قاصر رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے۔ کہ نئے لکھنے والوں کی نئی نسل کا خاصا حصّہ اس سے متاثر ہو گیا ہے حالانکہ یہ شاعری جس کا کوئی بھی باقاعدہ موضوع اور مقصد نہیں۔ کلاسیکل شاعری کی ہی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ اور قاری کے ذہن میں تجرید اور زندگی سے فرار کا رنگ بھرتے ہوئے اس کے طبقاتی شعور کو کند کرتی ہے۔ اس سے نہ صرف محنت کشوں کے کاز کو نقصان پہنچتا ہے۔ بلکہ ترقی پسند ادب کے اثرات بھی زائل ہوتے ہیں۔ اس لئے ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کا فرض ہے کہ وہ فرائیڈی ادب کی طرح اس کو بھی رد کردیں۔ کچھ عرصے سے اس شاعری کی ایک اور جدید شکل بھی نمودار ہوئی ہے۔ جس میں قاری کے لئے ابلاغ کو بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ یہ بیمار ذہنوں کی پیداوار ہے۔ اس لئے اس پر بھی تنقید لازم ہے۔ اور ترقی پسندوں کو اس سے نہ صرف گریز کرنا چاہیئے۔ بلکہ اس وبا کا محاسبہ کرنا چاہیئے۔

★

ڈیرہ غازی خان اور اردو ادب

تمام اردو ادب کے سرسری جائزہ کے ساتھ میں چاہتا ہوں کہ ڈیرہ غازیخان کے ادب پر خصوصی طور پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اگرچہ ڈیرہ غازیخان بھی پاکستان ہی کا ایک حصّہ ہے۔ اور یہاں کے اردو ادب کا مطالعہ بھی عام اردو ادب کے مطالعے کے تحت آتا ہے۔ لیکن یہاں خصوصی طور پر اس کا ذکر اس لئے کیا جاتا ہے۔ کہ ہمارے لکھنے والوں نے چونکہ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ مل کر کام کرنا ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ ان کی رہنمائی کے لئے یہاں کے ادب کا علیحدہ مطالعہ کیا جائے۔

جہاں تک ڈیرہ غازیخان میں اردو نثر کا تعلق ہے۔ وہ تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے اور جو کچھ ہے اس کا ترقی پسند ادب سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ البتہ جہاں تک شاعری کا معاملہ ہے۔ وہ کلاسیکل ترقی پسند اور جدید شاعری کے ضمن میں آ سکتی ہے۔ کلاسیکل انداز

میں لکھنے والے صرف چند شاعر ہیں ۔ جو تقریباً بوڑھے ہو چکے ہیں ۔ اُن کی شاعری حسن و عشق اور گل و بلبل تک محدود رہی ہے ۔ اور اس پر بالکل وہی تنقید صادق آتی ہے ۔ جو گذشتہ اوراق میں کلاسیکل شاعری پر کی جا چکی ہے ۔ یہاں اتنی وضاحت ضروری ہے کہ نئے لکھنے والوں میں سے بہت ہی تھوڑوں نے اسے اپنایا ہے ۔

ترقی پسند شاعری جہاں تک یہاں کی ترقی پسند شاعری کا تعلق ہے آغا اعجاز اکرم مرحوم کا نام سرِفہرست ہے ۔ انہوں نے یہاں اس شاعری کی بنیاد رکھی اور اسے اپنے شاگردوں اور دوستوں میں رواج دینے کی کوشش کی ۔ لیکن افسوس ہے آغا صاحب کی وفات کے ساتھ ہی ان کے شاگردوں نے لکھنا چھوڑ دیا ۔ حالانکہ ان میں سے رئیس عدیم اچھے شاعر ہو سکتے تھے ۔ البتہ انہوں نے افسانہ نویسی کا آغاز کیا ہے ۔ امید ہے ڈیرہ غازیخان میں نثری ادب کے خلا کو پُر کر سکیں گے ۔

البتہ نوجوان شاعروں میں اقبال شاہد ۔ انجم صہبائی ۔ کاوش عباسی ۔ ارشاد تونسوی اور راقم الحروف نے اس کو اپنا رکھا ہے ۔ لیکن افسوس ہے اسے کسی ہمہ گیر تحریک کا رنگ ابھی تک نہیں مل سکا پھر بھی یہ کوششیں غنیمت ہیں ۔ امید ہے کسی نہ کسی روز بار آور ہوں گی ۔

جدید شاعری

جہاں تک یہاں کی جدید شاعری کا معاملہ ہے اسے ایک گروپ نے سینے سے لگا رکھا ہے۔

لیکن دراصل اس گروپ کا وجود صرف اس کے سربراہ کیفؔ انصاری کے دم کا مرہونِ منت ہے۔ یہ سب حضرات ڈاکٹر وزیر آغا کے گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ان کے نظریۂ ادب پہ یقین رکھتے ہیں۔ لیکن اس گروپ نے ہمیشہ کسی نہ کسی سطح پہ مارکسی شاعروں کے ساتھ تعاون کا ثبوت دیا ہے۔ اور یہ چیز بھی زیادہ تر اس گروپ کے سربراہ کی وجہ سے ہے

سرائیکی ادب

میری خواہش ہے کہ میں یہاں مختصراً سرائیکی ادب کا بھی جائزہ لے لوں۔ اگرچہ آپ کے نزدیک یہ ایک بے جوڑ سی بات ہو گی۔ لیکن میرے خیال میں ڈیرہ غازیخان میں اردو شاعری کی نسبت یہ شاعری زیادہ موثر حیثیت رکھتی ہے کیونکہ سرائیکی نہ صرف یہاں کے عوام کی زبان ہے بلکہ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں کی بھی یہی مادری زبان ہے اور اس کے ذریعے وہ قاری کو بڑے اچھے طریقے سے متاثر کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پیپلز پارٹی کی تحریک کے دوران اس قسم کے پیشہ ور شاعروں نے اچھا خاصا کام کیا۔

شاعری

جہاں تک سرائیکی ادب کا تعلق ہے۔ وہ صرف شاعری پر مبنی ہے۔ اور آج تک سرائیکی میں جو شاعری ہوئی ہے

وہ کلاسیکل قسم کی شاعری ہے جس میں دوہڑوں اور کافیوں کے ذریعے حسن وعشق کا رونا رویا گیا ہے۔ البتہ بعض صوفی شعراء نے تصوف کو بھی موضوع بنایا ہے۔ جس میں کسی حد تک انسان دوستی کی مثال ملتی ہے۔ اس سلسلے میں خواجہ فرید کا نام خصوصی طور پر لیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ترقی پسند شاعری کا تعلق ہے ابھی تک مارکسی انداز کو نہیں اپنایا گیا۔ البتہ پیپلز پارٹی کی تحریک کے دوران بہت سے شاعروں نے جذباتی انداز میں غریبوں کے دکھڑوں کا رونا رویا ہے۔ اور انہیں اپنی حالت بدلنے کی تلقین کی۔ لیکن چونکہ ان کی سوچ منظم طبقاتی شعور سے عاری تھی۔ اس لئے وہ تمام برائیوں کا علاج مذہب کو بتاتے تھے۔ نتیجتہً وہ پیٹی بورژوا موقع پرستی کا شکار ہو کر پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران یا تو اس کے ساتھ ہو گئے۔ یا کسی ناراضگی کی وجہ سے گوشۂ گمنامی میں جا کر دوسرے شعراء کی طرح حسن وعشق کا دُکھڑا رونے لگے۔ اس لئے ان شاعروں کے اس ہنگامی جذباتی اُبال کو باقاعدہ طور پر ترقی پسند ادب کی تخلیقی کوشش نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ علّامہ غلام حسین زائر اور جمشید احمد کمتر رسول پوری کی شاعری میں کسی حد تک طبقاتی شعور کا احساس ملتا ہے۔ جہاں تک جدید شاعری کا تعلق ہے۔ سرائیکی میں ابھی تک یہ رواج پذیر نہیں ہوئی۔ البتہ کیف انصاری نے حال ہی میں

اس سلسلے میں کچھ منظومات کہی ہیں۔

آخر میں اتنا عرض کر دوں کہ اگرچہ یہاں سرائیکی شاعری کا ذکر ڈیرہ غازیخان تک محدود ہے۔ لیکن حقیقتاً" یہ جائزہ تمام سرائیکی شاعری کیلئے بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ سرائیکی کے تمام علاقے میں شاعری کی بالکل ڈیرہ غازیخان جیسی صورتِ حال ہے۔

چند مشورے میں مضمون کے خاتمہ پر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں، شاعروں اور کارکنوں سے درخواست کروں گا کہ انہیں کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ زیادہ سے زیادہ نئے لکھنے والوں کو محنت کشوں کی اس سیاسی اور ادبی تحریک میں شامل کریں اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے نوجوانوں کو اس طرف ڈھالا جائے۔ کیونکہ پرانے لکھنے والے اپنا ایک امیج بنا چکے ہیں۔ اور وہ اس کو کسی طرح تباہ کرنا نہیں چاہتے۔ اس لئے ان پر کوشش کرنا بیہودہ ہوگا

دوسری چیز یہ ہے کہ نئے لکھنے والوں کو مارکسزم سے ضرور واقف کیا جائے۔ ورنہ حالات کے بارے میں ان کے تجزیے غلط ہوں گے۔ جس سے قارئین میں گمراہی پیدا ہو گی۔ بعض اوقات تو یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایسے لوگ صحیح طبقاتی شعور نہ ہونے کی وجہ سے خود مزدوروں کی تحریکوں کی مخالفت شروع کر دیتے ہیں۔

تیسری چیز یہ ہے کہ انہیں ترقی پسند ادب کی روایت کا بھی مطالعہ کرایا جائے۔ تاکہ وہ اس کے انداز کو سمجھ سکیں۔ اور اس کے مطابق تخلیقات پیش کر سکیں۔ خصوصی طور پر مارکسی نظریئے اور ادب کا مطالعہ سرائیکی شعراء کے لئے زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ وہ عموماً دیہات کے رہنے والے ہوتے ہیں۔ اور مارکسزم کے بارے میں صحیح مطالعہ کم رکھتے ہیں۔

آخر میں پھر یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ نئے لکھنے والوں پر زور دیا جائے کہ وہ محنت کشوں کی زندگی سے براہِ راست تعلق پیدا کریں۔ اور ان کی طبقاتی جدوجہد میں شامل ہوتے ہوئے انہیں مارکسی جدلیاتی فلسفے سے لیس کریں۔ لیکن اس کے ساتھ اس بات کا دھیان رکھنا لازمی ہے۔ کہ ان کی تخلیقات فنی معیار پر بھی پوری اتریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بقول ماؤزے تنگ ان کا اسٹائل اشتہاری اور نعرہ بازی کا ہو جائے۔ جس سے تحریک کے مقاصد کو بجائے فائدے کے نقصان پہنچے۔

×

سید پریس ملتان) کتابت اعجاز قلم (بی۔ اے۔ عالم اردو) ڈیرہ غازیخان